زباں پہ آیہ ایاک نستعین بھی رہی
صنم کے پاؤں پہ لیکن تری جبیں بھی رہی

سورۃ فاتحہ

میں

معرفتِ الٰہیہ کا تعارف

جس کے پڑھنے سے شرک اور دہریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

علامہ ابوالخیر اسدی

مجلس نشر السنۃ
مخدوم رشید (ملتان)

ہ زباں پہ آیہ ایاک نستعین بھی رہی
صنم کے پاؤں پہ لیکن تری جبیں بھی رہی

سورۃ فاتحہ

میں

معرفتِ الٰہیّہ کا تعارف

(پوسٹر)

جس کے پڑھنے سے شرک اور دہریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

علامہ ابو الخیر اسدی

مجلس نشر السُّنّہ
مخدوم رشید
(ملتان)

الحمد للہ رب العالمین

میں معرفتِ الٰہیہ کی تشریح

اس کا لفظی مفہوم یہ ہے :۔۔۔۔۔

"ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو ساری کائنات کا پروردگار ہے"۔۔۔۔!

یہ جملہ قرآنِ کریم کا حرفِ اوّل ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کو اجمال کے انداز میں بیان فرمایا ہے۔ الحمدُ میں ہمیں حُکم دیا گیا ہے کہ ہر قسم کی تعریف صرف اللہ ہی کیلئے کیجائے پھر اس کے بعد ایاک نعبدُ و ایاک نستعین میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ حمد یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ ہی کی جائے اور اپنی ہر احتیاج کی تکمیل کے لئے اُسی ذات سے مدد طلب کی جائے۔۔۔۔۔

عبادت کی بُنیادی شرط یہ ہے کہ جس ذات کی عبادت کی جا رہی ہے عابد کے علم اور یقین میں اُس ذات کا صحیح تعارف بھی موجود ہو۔ اس لئے ربّ العالمین کے جملے میں اللہ نے پہلے اپنا اجمالی تعارف کرا دیا ہے۔ تاکہ ہر عابد جب بھی حمد کی صورت میں اللہ کی عبادت کرے، اس کے ذہن میں معبودِ حقیقی کا صحیح تصوّر پہلے موجود ہو ورنہ اس تصوّر میں جس قدر بھی نقص موجود ہو گا اس کی تمام عبادتیں بیکار ہو جائیں گی۔۔۔۔۔

ربّ العالمین میں اجمالی تعارف کی تلخیص یہ ہے :۔ (۱) کہ عالمین اضافت

کے لحاظ سے رَبّ کا مضاف الیہ ہے۔ دو چیزوں کے درمیان اِضافت اس لئے بیان کی جاتی ہے۔ جہاں مضاف الیہ اور مضاف میں حقیقی مغائرت پائی جاتی ہو۔ ورنہ دو چیزوں میں اضافت ظاہر کرنے کا کیا فائدہ ؟

اَب اِس کا مطلب یہ ہے کہ رَبّ اپنی جن مخصوص صفات کے ساتھ مختص ہے عالمین سے مغائرت کی وجہ سے اس پر مخلوق کی کسی صفت میں بھی مماثلت نہیں ہو سکتی اسی طرح عالمین کی ہر ہر نوع جن صفات کی حامل ہے۔ رَبّ سے مُغائرت کی وجہ سے اس کی کسی نوع پر بھی الوہی صفات کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ اِس مغائرت نے خالق اور مخلوق کے درمیان ہر قسم کی مماثلت اور اتحاد کو ختم کر دیا ہے۔ امام ابنِ تیمیہؒ ایک اِمام کا قول کا نقل کرتے ہیں کہ توحید یہ ہے :

اِفْرَادُ الْقَدِیْمِ عَنِ الْحَادِثِ	قدیم ذات کی اِس طرح تفرید اور تجرید بیان کی جائے کہ قدیم ذات اور کائنات میں حقیقی مغائرت ثابت ہو جائے

ربّ العالمین میں وحدت الوجود کے بنیادی عقیدے کی بھی اچھی طرح تردید موجود ہے کہ اضافت کی وجہ سے جب عالمین اور رَبّ میں حقیقی مغائرت ثابت ہو رہی ہے۔ تو پھر اِن دونوں کے درمیان عینیّت اور وحدت کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔ اور نہ کوئی مخلوق اللہ کی کسی صفت کی مظہر بن سکتی ہے۔ اِس لئے کہ ظاہر اور مظہر میں جب تک کسی قسم کی مُشارکت نہ مانی جائے، کوئی وجود اپنی کسی صفت کو کسی مظہر میں منعکس نہیں کر سکتا، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے جتنے اکابر گذرے ہیں وہ مخلوق کو مظہرِ الٰہی ثابت کرنے کے لئے یہ مثال دیتے ہیں کہ جس طرح آئینہ میں سورج کی شعاعیں منعکس ہو جاتی ہیں۔ اِسی طرح صفاتِ الٰہی بھی اپنے مقربین بندوں میں

ظاہر ہوجاتی ہیں، لیکن وہ حضرات اس مثال سے یہ بات بھول گئے کہ سورج اور آئینہ کی مثال میں شعاعوں کا انعکاس اس لئے صحیح ہے کہ وہ دونوں محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں اور یہاں مقربین کا وجود تو محسوسات سے تعلق رکھتا ہے لیکن اللہ کی ذات چونکہ غیر مرئی ہے اور غیر محسوس ہے اس لئے اس کی کوئی صفت بھی محسوس مخلوق پر منعکس نہیں ہو سکتی۔ دیکھئے! اضافت کی اس مغائرت نے دنیا کے کتنے اتحادی اور شرکیہ نظریات کا ابطال کر دیا ہے ——

۲ —— ربّ العالمین میں معرفت کی ایک تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عالمین کا ربّ ہے اور عالمین کا ذرّہ ذرّہ اس ربّ کا مربوب ہے۔ مربوب چیز وہ ہوتی ہے جو اپنے وجود کی تکمیل کے لئے کسی دوسرے کی محتاج ہو۔ ربّ کا مفہوم یہ ہے، امام راغبؒ فرماتے ہیں :——

ھُوَ اِنْشَاءُ الشَّیْ حالاً فحالاً الی حد التمام ——	یعنی کسی چیز کو اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح بتدریج نشوونما دیتے رہنا کہ وہ چیز اپنی استعداد کے مطابق حدِ کمال کو پہنچ جائے ——

مثلاً جب بچّہ پیدا ہوتا ہے اگر اس کی پیدائش کے بعد اس دنیا میں اس کی نشوونما کا انتظام نہ کیا جائے تو وہ اپنی طبعی عمر کو کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر چیز اپنے آغاز سے لے کر انجام تک اپنے وجود کے بقاء کے لئے ہر وقت اللہ کی ربوبیت کی محتاج رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا اس کائنات کی ہر مخلوق اپنی تخلیق کے لحاظ سے اتنی ناقص اور محتاج ہے کہ جب تک ربّ کی ربوبیت اس کی بقاء کا انتظام نہ کرے کوئی چیز بھی اپنے وجود کو اس دنیا میں قائم نہیں رکھ سکتی۔ قرآن میں جہاں جہاں

ربّ کا اسم استعمال کیا گیا ہے آپ دیکھیں گے وہاں اُس کے ساتھ کسی نہ کسی مربوب کا ذکر بھی ضرور شامل ہو گا ____

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا وجود کائنات میں سب سے برتر ہستی ہے۔ قرآن کے اکثر مقامات میں آپؐ کو ربّک کی اضافت کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے جیسے واذکر اسم ربّک۔ سبح اسم ربّک۔ اِس میں ربّک کا مفہوم یہ ہے کہ اے رسول جب تیری ہستی اپنی بقا کے لئے اس کی ربوبیت کی محتاج ہے تو آپؐ پر لازم ہے کہ آپؐ بھی اپنے ربّ کی تسبیح اور تقدیس کرتے رہیں۔ دُعاؤں کی آیات میں اکثر رَبَّنَا کا لفظ آتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے ربّ جب ہمارا وجود تیری ربوبیت کے سہارے قائم ہے تو ہمارے ان مصائب کو بھی تو ہی دُور کر سکتا ہے ____ اس سے معلوم ہوا کہ کائنات کی ہر مخلوق جب اپنے وجود کی بقا کے لئے ہر وقت اُس کی ربوبیت کی محتاج نظر آتی ہے۔ تو وہ مخلوق جو خود محتاج اور عاجز ہے وہ دوسری مخلوق کی کس طرح سہارا بن سکتی ہے۔ مُشرکین جن انبیاء اور اولیاء کو اپنے مصائب میں سہارا بنائے ہوئے ہیں۔ اُنہیں یہ آیت چیلنج کر رہی ہے۔ جب تک آپ لوگ ان قدسی نفوس کو عالمین سے خارج نہ کریں گے وہ مربوب اور عاجز ہونے کی وجہ سے آپ کی کوئی مُصیبت بھی دُور نہیں کر سکتے:____

اِس آیت میں ربّ العالمین کا مفہوم دیکھئے:____

فَلِلّٰہِ الحمدُ ربّ السمٰوٰتِ وربّ الارض ربّ العٰلمین وَلہ الکبریاء فی السمٰوٰت والارض وھوالعزیز الحکیم ____	پس ہر قسم کی ستائش صرف اللہ کے لئے ہے۔ جو آسمانوں اور زمینوں اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا پروردگار ہے ____

دیکھئے۔! اس آیت میں عالمین کو علیحدہ علیحدہ ذکر کر کے پھر اس کے ساتھ آسمانوں

اور زمینوں کو بھی شامل کر دیا ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے۔ اس کائنات کی ہر مخلوق عالمین کے دائرے میں شامل ہے۔ جو مجموعی طور پر اس کی ربوبیت کی محتاج ہے ——

۳ —— عالمین کے لفظ میں معرفتِ الٰہی کی ایک اہم دلیل یہ ہے۔ عالمین لفظ عالَم کی جمع ہے۔ عالم بروزن خاتم ہے۔ جو اسم آلہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے خاتم اُس انگوٹھی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اہم دستاویز پر مُہر لگا دی جاتی ہے پس اسی طرح عالم کا مفہوم وہ علامت ہے۔ مَا یُعْلَمُ بِہٖ الشَّیْءُ جس کے ذریعے کسی چیز کو معلوم کیا جا سکے۔ پس یہاں ساری کائنات کو عالمین اس لئے کہا گیا ہے۔ اس میں جتنی بھی مخلوق ہے عَالَمْ یعنی علامت اور دلیل ہونے کی وجہ سے کسی ہستی کے موجود ہونے کی نشاندھی کر رہی ہے ——

قاعدہ یہ ہے جہاں کوئی چیز بطور علامت استعمال ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس علامت سے اس کا مدلول دریافت ہو سکے۔ جیسے تیز دھوپ کی علامت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورج آسمان پر پوری تمازت کے ساتھ موجود ہے اسی طرح کائنات کی ہر چیز جو اپنے اپنے مقام پر قائم ہے۔ اس بات کی علامت ہے کہ وہ کسی قائم کرنے والی ہستی کی نشاندہی کر رہی ہے۔ کوئی طویل چھت دیواروں اور ستونوں کے بغیر کھڑی نہیں ہو سکتی —— لیکن آسمان کو دیکھئے کہ وہ کس طرح طویل اور بلند ہونے کے باوجود ستونوں کے بغیر ایک ہی سطح پر قائم ہے اس کا ستونوں کے بغیر قائم ہونا اس بات کی علامت ہے کہ کوئی ایسی ہستی ضرور موجود ہے جو اپنی قدرت سے اتنی وسیع عمارت کو تھامے ہوئے ہے۔ ورنہ ایسی بلند اور وسیع چھت کسی سہارے کے بغیر کس طرح قائم رہ سکتی ہے۔ جب ایک لفظ میں چند حروف ایک ترتیب سے رکھے جاتے ہیں۔ تو وہ لفظ ایک مُسمّٰی وجود کے مفہوم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے شین، یا اور را کو ملانے سے شیر کا لفظ بن جاتا ہے جس سے

ہم معلوم کر لیتے ہیں کہ اس سے ایک طاقت جانور مراد ہے۔ اسی طرح ہر چیز حروف کی شکل میں کائنات کی وسیع سطح پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایک صاحب بصیرت جب اس کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے الفاظ ڈھل ڈھل کر ایک ایسا مفہوم پیدا کر دیتے ہیں جس سے معرفت الٰہی خوب آشکارا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مشرک قوم سورج اور چاند کے وجود کو اپنا ربّ سمجھے ہوئے تھے وہ صرف ان کی روشنی اور حدّت سے متاثر تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ایک صحیح بصیرت کے حامل تھے، انھوں نے جب سورج کا مشاہدہ کیا کہ واقعی سورج اپنی حدّت اور روشنی میں بڑا کمال رکھتا ہے، لیکن غروب ہونے کے بعد جب اس کی روشنی اندھیرے میں تبدیل ہو گئی تو آپ نے فرمایا یہ کیسے ربّ ہو سکتا ہے جو اپنے وجود کو ایک جگہ تھام سکتا ہے اور نہ اس کی روشنی اندھیرے کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہم ایسے بھاگنے اور چھپنے والوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے، دیکھئے وہ مشرک لوگ صرف سورج کی حدّت اور روشنی کی وجہ سے اُسے اپنا ربّ بنائے ہوئے تھے، لیکن اس کا غروب ہونا جو اُس کے تغیّر کی اہم دلیل تھی وہ اُس دلیل کے مفہوم کو قطعاً نہ سمجھ سکے کیونکہ جو چیز اپنی کامل حالت کے بعد ناقص حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے وجود پر کسی دوسری ہستی کا تغلّب ہوتا ہے۔ جو اُس چیز کے کامل کو ایک ناقص حالت میں تبدیل کر دیتی ہے ——

اب آخر میں اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہمیں جس حمد کے بیان کرنے کا حکم دیا گیا ہے اُس حمد کا طریقہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ الحمد للہ میں پہلے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر ستائش کا مستحق ہے، پھر اس دعویٰ کے مدلول پر یہ دلیل لائی گئی ہے۔ وہ ذات چونکہ ساری کائنات کی پروردگار ہے، اس لئے وہ ہی ہر ستائش اور حمد کی مستحق ہو سکتی ہے۔ اب حمد کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہم

رب العالمین میں مغائرت ثابت کر کے تمام کائنات کو اس کا محتاج اور مربوب سمجھیں اور ربّ کو کائنات کے ذرّے ذرّے کا مربّی اور پروردگار سمجھیں۔ اس عقیدے کے اظہار کو اللہ کی حمد کہتے ہیں۔ اور اس حمد کی عملی صورت کو اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے ـــــــ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور جب تُو نے ساری کائنات کو اپنا مربوب اور محتاج ثابت کر دیا ہے ـــــــ اس لئے کسی دوسرے سے نہیں بلکہ ہم اپنی ہر حاجت میں تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی حمد کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے جیسے ایّاک نعبد و ایّاک نستعین میں بیان کیا گیا ہے۔ حمد کے اس طریقۂ قویم کا نام صراطِ مستقیم ہے۔ جو لوگ اس طریقہ پر چلتے رہے ہیں۔ اُن کا ذکر اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں کیا گیا ہے۔ اَب لازم تھا کہ اُن انعام یافتہ نفوس کو اس کا بہترین صلہ بھی دیا جائے۔ اور جن لوگوں نے اس طریقہ قویم کو اپنے اختیار سے چھوڑ کر دُوسرا راستہ اختیار کر رکھا تھا۔ اُنہیں بھی اس نافرمانی کی پُوری سزا دی جائے ـــــــ

مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہم نے ایک ایسا دن مقرّر کر دیا ہے جہاں پر ہر سعید اور شقی کو اپنے اپنے عمل کا پُورا معاوضہ مل جائیگا۔ اسلام میں سب سے زیادہ جس عبادت میں عملی توحید کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ نماز ہے۔ حدیث میں ہے نماز کی جو اصل رُوح ہے وہ سورہ فاتحہ ہے۔ اس کو ہر نماز میں اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ اس سورۃ کا جو بُنیادی مفہوم ہے وہ ہر نمازی کے عقیدے میں ہر وقت مستحضر رہے اور یہ ایسا مفہوم ہے جس کے استحضار سے نمازی (واسجد واقترب) تقرّب الٰہی کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ حدیث میں ہے جب انسان نماز کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ کُفر کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس عمل سے تقرّب الٰہی حاصل ہو سکتا تھا، جب اُسے عمداً چھوڑ دے گا تو لازماً رفتہ رفتہ کُفر کے کنارے تک پہنچ جائیگا۔

خلاصۃ المقصود

۱ — الحمد للہ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہر قسم کی عبادت اور حمد کا مستحق صرف اللہ ہے۔ رب العالمین میں اس دعویٰ کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ جو ذاتِ کائنات کو معدوم سے موجود کر کے اس کی ہر مخلوق کی پرورش کر رہی ہے وہی ذات ہر قسم کی عبادت کے لائق ہو سکتی ہے ————

۲ — معرفت کی پہلی دلیل یہ ہے کہ رَبّ اور عالمین کے تعلّق کو اضافت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ دو چیزوں کے درمیان اضافت چونکہ مغائرت پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے رَبّ کو ایسے دَرجے میں رکھا جائے کہ اس کی کوئی صفت بھی مخلوق پر ثابت نہ ہو سکے اور عالمین میں جتنی مخلوق شامل ہے اُسے کسی ایسی صفت سے موصوف نہ کیا جائے جو رَبّ کی کسی صفت کے ساتھ مماثلت رکھتی ہو۔ عیسائی اپنے عقیدۂ تثلیث میں حضرت عیسٰی پر بھی الوہیت کی اسی صفت کا اطلاق کرتے ہیں جس الوہیت کے ساتھ اللہ کی ذات مختص ہے۔ اس کی بُنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ربّ العالمین میں حقیقی مغایرت کو ملحوظ نہیں رکھا، نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عیسٰیؑ جو عالمین کی مخلوق میں شامل تھے وہ رَبّ کے درجے میں شامل ہو گئے اور اللہ تعالیٰ اپنی الوہیت سے گر کر حضرت عیسٰیؑ کے برابر ہو گئے۔ جن حضرات کے نزدیک حقیقۃ محمدیہ کی وجہ سے ذاتِ نبویّہ پر رَبّ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ علّامہ کاظمی لکھتے ہیں۔ اس عقیدے کا مبنیٰ وحدۃ الوجود کا نظریہ ہے۔ اور وحدۃ الوجود ایک ایسا نظریہ ہے جو مسلمانوں کے اکثر مسالک میں مسلّم ہے۔ اس لئے ایسے عقیدہ والوں کی تکفیر کرنا اُمّتِ مسلمہ کی پوری اکثریت کی تکفیر ہو جاتی ہے۔ دیکھئے، اس عقیدہ کی بُنیادی غلطی بھی یہی ہے۔ چونکہ وحدت الوجود کے نظریئے میں کائنات اور خدا کے درمیان حقیقی عینیت اور وحدۃ ثابت ہو جاتی ہے۔ اس لئے ذاتِ نبویّہ جو کائنات میں داخل تھی مغایرت

کے ارتفاع سے ربوبیت کے درجہ میں داخل ہوگئی۔ منصور حلاج نے بھی انا الحق اس لئے کہا تھا، اس کے نزدیک فنا کا یہ مفہوم تھا جہاں قدیم اور حادث کے درمیان مغائرت مرتفع ہوجاتی ہے۔ ابن عربی اپنی کتاب فصوص الحکم میں لکھتا ہے کہ فرعون کا یہ قول کہ میں رَبّ ہوں۔ اس کا یہ قول اس لئے صحیح ہے کہ اسے بھی ہمارے نظریئے کے مطابق خدا کے ساتھ عینیّت حاصل تھی دیکھئے الحمدُ للہ رب العالمین میں مخلوق اور خالق کے درمیان مغائرت کو ملحوظ نہ رکھنے سے کس طرح یہ لوگ جادۂ قویم سے بھٹکتے رہے ہیں ——

۳ — معرفت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ رَبّ پر ربوبیت کا اطلاق ہوتا ہے اور عالمین کی ہر مخلوق مغائرت کی وجہ سے مربوبیت میں داخل ہوجاتی ہے۔ ہر مربوب چونکہ اپنی بقا کے لئے ہر وقت رَبّ کا محتاج ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کسی دوسرے کی قطعاً مدد نہیں کر سکتا۔ ایّاک نستعین کا یہی مفہوم ہے کہ اے اللہ! ہم ہر مصیبت میں تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ انبیاء اور اولیاء سے اس لئے مدد طلب نہیں کرتے کہ وہ مربوب ہونے کی وجہ سے وہ خود ہی اپنے حوائج میں محتاج اور عاجز نظر آتے ہیں ——

۴ — معرفت کی تیسری دلیل یہ ہے، عالمین لفظ عالَم کی جمع ہے۔ عالَم اس علامت کو کہتے ہیں جس کے نشان سے کسی دوسری ہستی کی نشاندہی ہوسکے، اس لئے قرآن میں ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ کائنات کی ان چیزوں میں تدبّر کریں تاکہ تم ان کی تنظیم اور تزئین کا مشاہدہ کرکے ذاتِ باری کے خالق اور فاطر ہونے کا اقرار کرسکو ——

سارے رسولوں نے توحید کی دعوت میں سب سے پہلے جس آفاقی دلیل کو پیش کیا ہے وہ یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ساری کائنات کا فاطر ہے اس لئے اس کی ذات میں کسی قسم کے تردّد اور شک کی گنجائش نہیں ہوسکتی ——

قالت لهم رسلهم افی اللہ شك	ہر رسول اپنی اپنی قوم کو توحید سمجھانے میں یہی دلیل پیش کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ سا ری

فاطرِ السمٰوٰت والارض
(القرآن)

کائنات کا فاطر ہے تو اتنی مضبوط دلیل کے بعد اب اس کی ذات میں کس طرح تردّد ہو سکتا ہے،

معرفتِ الٰہیہ کے یہی بنیادی اصول ہیں جن پر انسان کی ابدی نجات موقوف ہے اس سے اگلے مضمون میں نظریۂ الحاد کی تردید کی گئی ہے۔ الحاد اور دہریّت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نیوٹن کے قانونِ تجاذب سے سائنس دان یہی سمجھتے تھے اس کائنات کی میکانکس صرف ایک ہی ہو سکتی ہے جس نے مذہب اور خدا کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں ——

کائنات میں شروع سے آخر تک علّت و معلول کا ایک ہی سلسلہ کارفرما ہے جس کی بنا پر اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تشکیل بھی ہو رہی ہے۔ اس لئے نہ کسی خالق کی ضرورت ہے اور نہ کسی قیّوم کی —— اس کے بعد سائنس کی دنیا میں زبردست انقلاب آ گیا ہے۔ اس میں نیلس کے نظریہ کوانٹم اور آئن سٹائن کے نظریہ اضافت نے علّت و معلول کے اس ابدی قانون کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے ——

اس مضمون میں اس کی عمدہ تحقیق کی گئی ہے۔ اہلِ بصیرت کے لئے ایک نفیس مقالہ ہے

سائنس کے جدید تصوّرات میں

دہریّت کا خاتمہ

ڈاکٹر رضی الدّین صدّیقی لکھتے ہیں۔!

جب نیوٹن نے سترھویں صدی کے اواخر میں قانونِ تجاذب کا انکشاف کیا اور علمِ حرکت کی تدوین کی تو ان قوانین کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے

والے واقعات پر کیا گیا بلکہ نظامِ شمسی کے سیّاروں اور دوسرے مظاہر پر بھی اس کو وُسعت دی گئی اور مشہور فرانسیسی ریاضی دان لاپلاس نے تو یہاں کہہ دیا کہ اس کائنات کی میکانکس ایک ہی ہو سکتی ہے اور اس میکانکس کو نیوٹن نے دریافت کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ اب اس سے آگے کسی اور کے لئے کچھ کرنا باقی نہیں ہے ——

اُنیسویں صدی میں اس میکانکس کی جڑیں اس قدر مضبوط اور وسیع ہو گئیں کہ نہ صرف طبیعی علوم میں بلکہ حیاتیاتی علوم میں بھی اُن کا اطلاق کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ علوم فلکیات، طبیعیات، کیمیا، اور حیاتیات میں اس غیر معمولی ترقی کی وجہ سے مادیّت اور دہریّت کو زبردست تقویّت پہنچی اور ظاہر میں لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ سائنس نے مذہب کی بُنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں شروع سے آخر تک علّت و معلول کا ایک سلسلہ کار فرما ہے جس کی بناء پر اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تشکیل بھی ہو رہی ہے۔ نہ کسی خالق کی ضرورت ہے نہ قیوّم کی ——

علمی دُنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات اُنیسویں صدی کے آخری حصّے میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اُسی زمانے میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بُنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہُوا۔ مادّہ اور توانائی، ذرّہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکان اور علّت اور معلول جیسے بُنیادی تصوّر ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانینِ قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تصوّرات نے نیوٹن اور میکسویل کی طبیعیات کی بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بُنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے۔ ان نئے تصوّرات کی کماحقہٗ تشریح کے لئے تو ایک پُوری کتاب درکار ہوگی لیکن ان کو کسی حد تک بتائے بغیر آگے بڑھنا بھی مشکل ہے کیونکہ اس مضمون کا دارو مدار بھی ان تغیّرات پر ہے جو جدید سائنس میں

ہیں ___ انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادّہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصور تھے۔ مادّے کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مجسّم شے ہے، جو ایک محدود فضا کو بلا شرکت غیرے احاطہ کرتی ہے جس کا ایک مستقل وزن ہوتا ہے جس کو کم بیش یا معدوم نہیں کیا جا سکتا، جب کوئی مادی شے حرکت کرتی ہے تو وہ ایک ہی خط میں کسی ذرّے کی طرح حرکت کرتی ہے۔ آواز یا روشنی کی موجوں کی طرح پوری فضا میں نہیں پھیل جاتی ___

اس کے برخلاف روشنی اور توانائی کے متعلق یہ خیال تھا کہ نہ تو وہ کوئی مجسّم شے ہے اور نہ کسی محدود فضا کو بلا شرکت غیرے گھیرتی ہے۔ اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا اور وہ ذرّے کی طرح حرکت نہیں کرتی بلکہ موجوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہے ___

جدید طبیعیات میں مادّے اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہو گیا اور تجربوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں کبھی مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کبھی توانائی مادّے میں۔ جب کوئی ذرّہ حرکت کرتا ہے تو اس کے وزن میں اضافہ ہوتا ہے اور جب وہ ذرّہ ساکن ہوتا ہے تو اس کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ ایک مادّی شے کبھی ذرّے کی طرح ایک خط میں اور کبھی موجوں کی طرح پھیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے ___ مادّے کے توانائی میں منتقل ہونے کا یہی راز اصل اصول ہے جس کی بناء پر جوہری بم بنایا گیا ہے ___

جوہر یا (AtoM) کے متعلق ۱۸۹۵ء تک سمجھا جاتا تھا کہ وہ مادّے کا سب سے چھوٹا ذرّہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس صدی کے آغاز میں پتا چلا کہ ہر جوہر کے اندر بہت سے دوسرے ذرّے ہوتے ہیں جو تین قسم کے اجزا الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جوہر کا مادّہ مسلسل پھیلا ہوا نہیں ہوتا بلکہ یہ ذرّے اس کے اندر نظامِ شمسی کی طرح ترتیب دیئے ہوئے ہوتے اور حرکت کرتے رہتے ہیں ہر جوہر کا مرکزی حصّہ جس کو NUCLEUS کہا جاتا ہے۔ اس کی ساری توانائی اور

مادّے کا مرکز ہوتا ہے اور اسی کی شکست وریخت سے جوہر کی ماہیّت بھی بدل جاتی ہے اور جوہری توانائی بھی حاصل ہوتی ہے ـــــ

کیمیائی عنصر سے متعلق سابقہ تصوّر یہ تھا کہ وہ ایک خاص قسم کے مادّے سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کی ہیئت اور ماہیت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے، جیسے ہائیڈروجن یا آکسیجن یا سوڈیم وغیرہ، چند سال قبل تک خیال تھا کہ ایسے کیمیائی عنصروں کی تعداد ۹۲ ہے اور ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا ہی اَمرِ محال ہے جس کی تلاش میں ازمنۂ وسطیٰ میں متعدد کیمیاگروں نے اپنی عمر بن ضائع کی تھیں، لیکن آجکل یہ کیمیاگری لیبارٹری میں ہر وقت کی جارہی ہے اور بعض عناصر میں قدرتی طور پر ہوتی رہتی ہے۔ ایک عنصر کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جن کو L S ot OPE کہا جاتا ہے اور لیبارٹری میں مصنوعی طور پر L SOTOPE تو کیا نئے عنصر بھی بنائے جارہے ہیں اور گذشتہ چند سال میں ۱۲ سے زیادہ نئے عنصر یورینیم کے اُوپر بنائے جا چکے ہیں ـــــ

مذکورہ بنیادی تصوّرات کے بدلنے کی وجہ سے علّت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آ گیا ہے۔ نیوٹن کی میکانکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعیّن ہوجائے گی اور محض قوانینِ حرکت کی بناء پر علم ریاضی کی مدد سے اس کی تمام حالتوں کو ازل تا ابد یہ معلوم کیا جاسکتا ہے سائنس کا یہی مسئلہ تھا جو مادّہ پرستوں کے لئے حکمِ فیصل کا کام دیتا تھا اور جس کی بناء پر وہ کسی خالقِ کائنات کے تصوّر کو غیر ضروری قرار دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کائنات کی حالت ہر لمحہ متعیّن ہے اور وہ اس کے مطابق خود بخود تشکیل پاتی چلی جارہی ہے۔

لیکن مادّہ اور توانائی اور ذرّہ اور موج کی ثنویت (DUALity) اور زمان و مکان کی اضافیت کی بناء پر ۱۹۲۷ء میں ہائی زن برگ نے ثابت کیا کہ مظاہرِ فطرت میں تعین یا جبر نہیں بلکہ عدمِ تعیّن یا امکان پایا جاتا ہے۔ اور ایک ذرّہ کسی وقت بھی بے شمار ممکنہ حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اختیار کرسکتا ہے۔ اسی طرح قوانینِ قدرت

تعینی نہیں بلکہ اوسطی (STATISTICAL) ہو جاتے ہیں۔ اور اُنیسویں صدی کے سائنس میں جو کٹر قسم کی سائنس پائی جاتی تھی، باقی نہیں رہتی ۔۔۔۔۔

اسی کے ساتھ آیۃ شریف " اللّٰہُ نورُ السمٰوٰت والارض " کا مفہوم بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ جب مادّہ اور روشنی میں غیریّت نہیں رہی تو مادّی اشیاء کے خالق کا غیر مادّی ہونا خلافِ قیاس نہیں ہو سکتا اور دہریوں کے استدلال میں کوئی جان باقی نہیں رہتی ۔۔۔۔۔

۱۹۲۲ء ۔ ۱۹۲۳ء کے بعد جب نیلس بوہر کے کوانٹم نظریئے میں یکے بعد دیگرے متعدد غلطیاں اور خامیاں منکشف ہونے لگیں تو ۱۹۲۵ء - ۱۹۲۶ء میں نئی کوانٹم میکانکس کی بُنیاد رکھتے ہوئے ہائی زن برگ اور ڈیراک نے بتایا کہ یہ غلطیاں اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ سائنس کا مقصد اور اس کا طریق کار صحیح طور پر متعیّن نہیں کیا گیا۔ سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہرِ فطرت کی انتہائی حقیقت یا غایت معلوم کرے بلکہ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیاء اور مظاہر میں باہمی ربط اور تعلّق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر یہ بتایا ہے کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ برق کی حقیقت یا ماہیّت کیا ہے، بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوّتِ برق کا عمل کیا ہے۔ اس طرح سائنس کا طریق کار اور دائرۂ عمل نئے سرے سے متعیّن ہو جاتا ہے اور فلسفہ یا مذہب کے ساتھ کسی تضاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔۔۔۔۔

اس سے بھی آگے چلیئے تو ہم دیکھیں گے کہ سائنس کے اساسی تصوّر میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا۔ یہ انقلاب سائنس کے بُنیادی قوانین کی تشکیل سے متعلّق ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے۔ اُنیسویں صدی کے ختم تک سائنس کے تمام بُنیادی قوانین استقرائی یعنی INBUCtiVE طریقے پر اخذ کئے جاتے تھے مثلاً قانونِ تجاذب ہی کو لیجئے۔ یہ قانون کہ کائنات کے کسی دو مادّی اجسام کے درمیان ایک معیّن مقدار کی تجاذبی قوّت پائی جاتی ہے، خاص مثالوں کی مدد سے اخذ کیا

گیا تھا۔ اسی طرح برقی مقناطیس کے قوانین یا روشنی کے منعکس یا منتشر ہونے کے قوانین سب استقرائی تھے ــــــ

لیکن ۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت کی تشکیل کے لیے جو قانون اور یا مفروضہ اختیار کیا وہ استقرائی نہیں بلکہ علمیاتی EPISTEMOLOGOCAL یا فلسفیانہ ہے۔ اس اصول کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ طبیعی قانون ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ تمام مشاہدین کے لئے غیر متغیر ہوں۔ خواہ یہ مشاہدین کسی قسم کی حالت حرکت یا سکون میں کیوں نہ ہوں۔ یہ مفروضہ جس پر نظریہ اضافیت کی تشکیل کی گئی ہے استقرائی نہیں ہے۔ اسی طرح عدم تعین کا اصول جس پر جدید کوانٹم میکانکس کا دارومدار ہے استقرائی بلکہ علمیاتی ہے

پروفیسر ایڈنگٹن نے سائنس کی اس نئی تحریک کو ایک بڑی دلچسپ مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرض کرو کہ ایک سائنس دان کسی تالاب سے ایک جال کے ذریعے مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ تاکہ ان مچھلیوں کے طول سے متعلق کوئی قانون بنا سکے۔ جب تمام دن کی محنت کے بعد وہ ان مچھلیوں کو جو پکڑی گئی ہیں ناپتا ہے تو بزعم خود ایک قانون کا انکشاف کرتا ہے کہ اس تالاب میں کوئی مچھلی ایک انچ طول سے کم نہیں ہے۔ اس کے اس فعل کو جب کوئی دوسرا سائنسدان دیکھتا ہے تو اس کو بتاتا ہے کہ تمہیں قانون کے اخذ کرنے کے لئے تمام دن اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم محض اپنے جال کو دیکھ کر جس کے تمام خانے ایک ایک انچ طول کے ہیں، شروع ہی میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اس جال سے کوئی ایسی مچھلی نہیں پکڑی جا سکتی جس کا طول ایک انچ سے کم ہو ــ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قانون فطرت کی تشکیل کیلئے علم کی نوعیت اور علم حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کرکے استقرائی قوانین کی بہ نسبت زیادہ دور رس اور دیرپا قانون بنائے جا سکتے ہیں، کیونکہ استقرائی قوانین تو ایک بھی مخالف مثال کی بنا پر غلط ثابت ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ نیوٹن کے قانون تجاذب کے متعلق معلوم ہوا کہ سیارۂ عطارد کا مدار اس قانون کی بنا پر غلط حاصل ہوتا ہے تو اس قانون کو ترک کر دینا پڑا۔

قرآنی دعوت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[ہمارا ایمان ہے کہ قرآنی دعوت و تعلیم ساری انسانی دنیا کے لئے آبِ حیات ہے اور جو اُمت اس کو کتابِ الٰہی مان کر اپنی زندگی اس کی رہنمائی میں گذارنے کا فیصلہ کرلے وہ اس کے لئے دنیا و آخرت کی ہر فلاح و سعادت کی ضامن ہے ——— لیکن صدیوں کی ہماری تقصیر سے صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کا کیا ذکر، قرآن کو کتاب اللہ ماننے والی جو اُمت اسوقت روئے زمین پر پھیلی ہوئی ہے جسکے افراد کی تعداد چالیس پچاس کروڑ سے ستر کروڑ تک بتلائی جاتی ہے، خود اس کا حال قرآن سے دوری کے بارہ میں یہ ہے کہ یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ فی صد نہیں بلکہ فی ہزار زیادہ سے زیادہ بس ایک دو اُن میں قرآنی دعوت سے کچھ تعلق اور واقفیت رکھنے والے ہونگے، اور باقی نوے ننانوے یا نوسے اٹھانوے فی ہزار وہ ہونگے جن کو قرآنِ پاک کی دعوت و تعلیم سے نہ واقفیت ہے اور نہ کوئی خاص تعلق! ——— لیکن چونکہ قرآن مجید سے یہ بُعد تدریجاً پیدا ہوا ہے اور صدیوں سے اُمت کچھ اسی حال میں ہے اسلئے ہم میں سے جن کو دین کا کسی قدر فکر ہے وہ بھی اس کو کچھ زیادہ محسوس نہیں کرتے حالانکہ اگر سوچا جائے تو یہ اتنا عظیم سانحہ اور اتنا بڑا حادثہ ہے کہ دوسرے بڑے بڑے اکثر وہ مصائب اور حوادث جو مختلف زمانوں میں مسلمانوں پر آئے اور جن کی یاد آج بھی ہم کو رُلا دیتی ہے وہ اِسکے سامنے ہلکے اور ہیچ ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے اُن مخلص بندوں کو جزائے خیر دے اور انکی مساعی کو مشکور فرمائے جنھوں نے اپنے اپنے زمانوں میں اس کو کچھ محسوس کیا، اور مختلف راہوں سے اس کیلئے کوششیں فرمائیں، یا جو آج بھی کسی طریقے پر اِس کیلئے کوشاں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ سے زیادہ بندے قرآنی دعوت و تعلیم سے آشنا ہوں، اور یہ آبِ حیات کسی طرح زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچ جائے۔